مطیع ہیں-کوئی دوسری قسم کی مخلوق ہے-آزادی ہی کا عملی ثبوت مہیا ہونے سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے -خواہ ناتجربہ کار انسان اول قدم میں ڈگمگا ہی کیوں نہ جائے -

خدا نے دیکھا کہ مخلوقات کی اطاعتِ جبری میں وہ لطف نہیں جو اس بندے کی اطاعت میں ہے، جسے خلاف ورزی کا اختیار تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی مرضی سے اطاعت کی، صراطِ مستقیم کو راہِ نجات سمجھا اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کا ہم آہنگ بنا دیا اور اس اتحاد کی وجہ سے اس کو الوہیت کا وہ قرب حاصل ہوا جو جلیل القدر ملائکہ کو بھی نصیب نہ تھا- خدا نے کہا کہ اب ہم کائنات کو محض غلاموں کی بستی دیکھنا نہیں چاہتے -خدا خود آزاد ہے، اس نے چاہا کہ وہ اب اپنی ہم رنگ مخلوق پیدا کرے، جو اختیار اور آزادی کے ساتھ اپنی خودی کو خدا کے سپرد کر دے اور اپنے تئیں من تو شدم تو من شدی کی معراج پہ پہنچا سکے -- قصۂ آدم میں ہبوط و عروج کی داستان کے اندر اسلام کی تمام تعلیم کا جوہر موجود ہے -اپنے اختیار سے ٹھوکر کھا کر سنبھلا ہوا انسان رفتہ رفتہ نیابتِ الٰہی اور خلافتِ ارضی کے رتبے تک پہنچ سکتا ہے اسی لئے اس دین نے سب سے زیادہ آزادئ ضمیر، آزادئ فکر اور آزادئ عمل کو مذہب اور تہذیب کی بنیاد قرار دیا ہے -انسان صد لغزشوں کے راستے ٹٹولنے والی مخلوق ہے اور اگر اس جستجو میں آزادی نہ ہو، اور غلطی کرنے کا امکان نہ ہو، تو انسان اور جمادات میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے -دین سب سے پہلے نیکی کی تلقین کا نام ہے لیکن جو نیکی جبر سے پیدا کی جائے وہ اخلاقاً نیکی میں شمار نہیں ہوتی -ایسی جبری نیکی کے لئے کون کسی کو قابلِ ستائش اور مستحق اجر سمجھتا ہے -اور ایسے شخص کے دین کی کیا قیمت ہے جسے بزورِ شمشیر یا بخوفِ تحقیر و تشہیر کسی عقیدے کے اقرار پر مجبور کیا گیا ہو- اس جبر سے تو اس کی انسانیت کا جوہر ہی ملیامیٹ ہو جائیگا، حالانکہ دین کا کام اس جوہر کو اجاگر کرنا ہے -ایک مغربی مستشرق نے لکھا ہے کہ قرآن کی تعلیم میں سب سے زیادہ شاندار چیز لا اکراہ فی الدین کا اعلان ہے کہ دین کے معاملے میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں -رسولِ کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی اور اسلام کے قیام و استحکام کی خاطر ان کی جدوجہد میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی شخص کو بزورِ شمشیر قبولِ اسلام پر مجبور کیا گیا ہو -کفار سے جنگیں اس لئے نہیں لڑی گئیں کہ ان کو مغلوب کر کے بجبر مسلمان کیا جائے، بلکہ ان جنگوں کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آزادئ ضمیر کے انسانی اور اساسی حق سے محروم کرنا چاہتے تھے انہوں نے محض ان کے دین کی وجہ سے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا -ازروئے قرآن قتال و جہاد صرف اسی گروہ کے خلاف جائز بلکہ فرض ہے جو انسانوں کو آزادئ ضمیر سے محروم کر کے ان کو اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے میں مزاحم ہو -- قرآن کریم نے اس کے متعلق نہایت وضاحت سے کہا ہے کہ اگر خدا ایسی ظالم اور جابر قوموں کے خلاف حریت کے علمبرداروں کو قتال و جہاد کے لئے کھڑا نہ کرتا تو دیر و کنشت و کلیسا و مساجد دنیا کے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے -اس آیت کریمہ کے اندر جو وسعتِ مشرب اور تمام مذاہب کے لئے جو آزادی کا اعلان ہے -اس پر غور کرو کہ خدا ہر ایسے گروہ کو تباہ کرنے کے لئے مجاہدین کو کھڑا کرتا ہے جو صرف اسلام ہی کی حفاظت کے لئے جان و مال کی بازی نہیں لگاتے بلکہ تمام مذاہب میں آزادئ ضمیر کو کچلنے والے جہاں بھی ابھریں ان کو مغلوب کرنا انسانیت کا فرض ہے -اس آیہ کریمہ میں مساجد کا ذکر اور تمام ادیان کے معبدوں

کی حفاظت کے بعد کیا گیا ہے تاکہ مسلمان یہ نہ سمجھ لیں کہ فقط اپنے مذہب کے معاملے میں ہی آزادیٔ ضمیر کے لئے جہاد فرض ہے۔ اس تعلیم کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسلامی جماعت اور مملکت محفوظ و مصئون ہو گئی تو ہر ملت کو آزادیٔ ضمیر کا چارٹر عطا کر دیا گیا عیسائیوں کو عطا کردہ یہ چارٹر اب بھی اپنے اصل الفاظ کے ساتھ فرامینِ حضرت عمرؓ میں محفوظ ہے۔ یہ طریق فکر و عمل رسولِ کریمؐ کی مثال سے شروع ہوا کہ مدینے میں اپنے ورود مسعود کے ساتھ ہی وہاں کے یہود کو یہ چارٹر عطا کیا گیا کہ اگر تم قیام امن میں ہمارے ساتھ تعاون برتو، تو تمہیں اپنے مذہب اور طریق زندگی کے متعلق تمام وہ حقوق حاصل ہونگے جو مومنین کی جماعت کو حاصل ہیں۔ اس کے بعد جب یہودِ مدینہ نے اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں عملی جدوجہد شروع کر دی اور اسلام کے دشمنوں کے ساتھ سازباز کا آغاز کیا تو ان کے خلاف جنگ کر کے ان کو مطیع کرنا پڑا۔ لیکن کسی یہودی کو بجبر مسلمان نہیں کیا گیا۔

قرآن کریم میں مشاہدۂ فطرت اور تفکر و تدبر کی تلقین اس قدر تاکید کے ساتھ ملتی ہے کہ اسکی مثال اور مذہبی صحیفوں میں نایاب ہے۔ حیات و کائنات لامحدود ہیں اور ان کے مظاہر کے ساتھ ان آئینوں اور قانونوں کا بھی کوئی شمار نہیں جو قرآن کی اصطلاح میں کلماتِ الٰہی کہلاتے ہیں تمام سمندر اور ان سے بھی زیادہ قلزم اگر لکھنے کی روشنائی بن جائیں تو یہ سب خشک اور ختم ہو جائیں، بیشتر اس کے کہ کلمات کا بیان ختم ہو۔ اس تلقین کے مطابق انسان کی تمام عمر اور اس کا ہر لمحہ انفس و آفاق کے آئین و قوانین کی جستجو میں صرف ہونا چاہیئے یہ عبادت کا وسیع ترین مفہوم یہی تفکر ہے۔ اگر آزادیٔ فکر نہ ہو تو یہ عبادت کیسے ادا ہو سکتی ہے تفکر کی ماہیت ہی میں آزادی سے سوچنا داخل ہے۔ آزادیٔ فکر سے اسلام اس لئے گھبراتا یا خوفزدہ نہیں ہوتا کہ اسے یقین کامل ہے کہ فکر آزاد ضرور ہزار دفعہ بھٹکنے کے باوجود بھی انسان کو زندگی کی صداقتوں سے آشنا کر سکتی ہے۔

مسلمانوں کی سلطنتوں میں شروع ہی سے غیر مسلم کثیر یا قلیل تعداد میں آباد رہے ہیں کبھی کسی مسلمان حکمران نے ان کی آزادیٔ ضمیر کو نہیں کچلا۔ مملکت سے وفاداری اور عامۃ المسلمین کے ساتھ دوش بدوش امن و امان کی زندگی بسر کرنے کے علاوہ اور کوئی تقاضا ان سے کبھی نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے بعض وسیع خطوں پر صدیوں کی حکمرانی کے باوجود مسلمان اقلیت میں رہے اور آخر میں ان کو رواداری کی یہ سزا بھگتنی پڑی کہ جب غیر مسلموں کو سیاسی یا عسکری غلبہ حاصل ہوا تو ان احسان ناشناسوں نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور ان کو فقط دو متبادل صورتیں پیش کیں، کہ یا اپنا دین بجبر بدلو اور یا بیک بینی و دو گوش باہر ہو جاؤ۔

یہ تو اسلام کی تعلیم اور مسلمانوں کے رویہ کا ایک روشن پہلو ہے جس نے انسانی تہذیب میں ایک گرانقدر عنصر کو داخل کیا۔ لیکن اس امر کا افسوس کے ساتھ ذکر کرنا پڑتا ہے کہ خلافت کے مملکت میں تبدیل ہونے کے بعد بعض سلاطین کی کج اندیشی اور مرورِ ایام سے اسلام میں پیدا ہونے والے فرقوں نے اسلام کے اس سبق کو فراموش کر دیا۔ غیر مسلموں سے تو کوئی تعرض نہ کیا کہ وہ اپنے افکار و عقائد میں ہر طرح آزاد رہیں لیکن مسلموں نے مسلموں کے ساتھ رواداری کو بالائے طاق رکھ دیا۔ مطلق العنان سلاطین نے سیاست کے معاملے میں عامۃ المسلمین کو بے دخل کر دیا اور مذہبی فرقوں میں سے کسی ایک کو

اختیار کر کے دوسروں کے لئے آزادیٔ افکار و گفتار کو ممنوع قرار دیا۔ چھوٹے چھوٹے فروعی اور فقہی اختلافات پبلک کے ذہن کی جان کے لاگو ہو گئے۔ کہیں شیعہ سُنّی کے جھگڑوں میں کہیں جبر و اختیار کی بحث میں، کہیں ذات و صفاتِ الٰہیہ یا خلقِ قرآن کے عقیدے کی بابت ناموافق رائے رکھنے والوں کے خلاف آمادۂ آزار و پیکار ہو گئے۔ ذرا ذرا سی بات پر تکفیر کے حربے استعمال ہونے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مُسلمان جو دُنیا کو آزادیٔ ضمیر کا پیام پہنچانے پر مامور ہوئے تھے سب دُنیا سے زیادہ متعصب شمار ہونے لگے۔ ملّتِ اسلامیہ کے انحطاط کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں لیکن ایک بڑا سبب آزادیٔ فکر کا فقدان ہے۔ مذہبی تعصب کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے۔ مشرقی تہذیب کا انداز یہ ہے کہ اس کے اندر ہر چیز دین کے احاطے میں آجاتی ہے۔ کھانا، پہننا، اُٹھنا بیٹھنا، علوم و فنون، طبیعیات کیمیا، علم الافلاک، معیشت سیاست، سب مسلّمہ عقائد کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، اور ان میں سے کسی چیز میں زاویۂ نگاہ یا طریقِ فکر و عمل کا اختلاف ایک اساسی دینی اختلاف بن جاتا ہے۔ جس کے بعد دو مخالفوں کا مل بیٹھنا یا مل کر خدا کے سامنے سجدہ کرنا بھی حرام ہو جاتا ہے۔ ایسی ملّتیں جاہل، پسماندہ اور مغلوب ہو جاتی ہیں۔ عالمِ انسانی میں ترقی تحقیق سے ہوتی ہے اور جمود کورانہ تقلید سے پیدا ہوتا ہے۔ جس زمانے میں مسلمان تہذیب و تمدّن میں اپنی معاصر دنیا سے کوسوں آگے تھے۔ اس زمانے میں تحقیق تقلید پر غالب تھی۔ باقی دُنیا کی پس ماندگی کی وجہ یہ تھی، کہ اور کسی جگہ مذہب اور علوم و فنون کے بارے میں آزادیٔ فکر نہ تھی۔ مغرب میں کلیسا کے استبداد نے مغربی زندگی کے ایک ہزار سال کو ازمنۂ مظلمہ بنا دیا اور تجدید کلیسا کی تحریک کے بعد مذہبی جنگوں نے مغربی تمدّن کے پرخچے اُڑا دیئے۔ اٹھارویں صدی میں اس تعصب کی خانہ بربادی کے خلاف زور و شور سے ردِّ عمل شروع ہُوا اور چونکہ سب تباہی مذہب کے نام پر ہوتی تھی۔ اس لئے مصلحین اس نتیجے پر پہنچے کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر دیا جائے۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ اِسلام زندگی کے کسی شعبے کو مذہب سے الگ کرنے کا قائل نہیں ہے۔ لیکن اگر تنگ نظری، عدم رواداری اور تقلیدِ محض میں لکیر کا فقیر بننے کا نام اِسلام ہو جائے، تو خطرہ یہ ہے کہ اصلاح پسند اور امن پسند لوگ اسلامی ملکوں میں بھی دین کو سیاست سے الگ کرنے کی فکر کرنے لگیں۔

استبداد خواہ سیاست میں پیدا ہو اور خواہ دین میں وُہ آزادیٔ فکر کو ختم کر دیتا ہے اور تاریخِ عالم میں جا بجا ایسا ہُوا ہے، کہ سیاسی استبداد نے دینی استبداد کے ساتھ ایک ابلیسانہ سمجھوتہ کر کے انسانوں کو غلام بنایا ہے۔ جب کسی قوم میں خودداری اور آزادی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو اس دو گونہ استبداد کے خلاف جہاد کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

روسی انداز کی اشتراکیت اسی استبداد کے خلاف ظہور میں آئی جس میں عرصۂ دراز سے دین اور سیاست کا گٹھ جوڑ تھا۔ اور جہاں راسپوٹین جیسے لوگ دین کی آڑ میں مملکت کی مشین پر قابض ہو جاتے تھے۔ اس کے خلاف ایسا زور شور کا ردِّ عمل ہُوا کہ پہلی معیشت اور سیاست کے ساتھ ساتھ دین بھی سوختہ ہو گیا۔ اور آزادیٔ فکر کا یہ حال ہُوا کہ عبادت کرنے کی

تو آزادی ہے لیکن دینی عقائد کی تبلیغ کی اجازت نہیں۔ دین کی مخالفت میں ہر شخص کو کامل آزادی بلکہ حکومت کا عملی تعاون حاصل ہے۔ لیکن دین کی حمایت میں کچھ کہنا یا کرنا ممنوع ہے۔ توحید ممنوع ہے لیکن الحاد آزاد ہے۔

اس انقلاب میں انسانوں کو ایک استبداد سے نجات ملی لیکن ایک دوسرے استبداد میں ان کا فکر و عمل پابزنجیر ہو گیا۔ کوئی حریت پسند انسان ایسی معاشرت میں ایک دن بھی آزادی کا سانس نہیں لے سکتا۔ افسوس ہے کہ ہر قسم کے استبداد کے مقابلے میں ہم اسلام کو تو پیش کر سکتے ہیں لیکن موجودہ مسلمانوں کو پیش نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود حریتِ فکر و عمل کا سبق فراموش کر چکے ہیں۔ دین کے غلط جوش میں بعضوں کا یہ حال ہے کہ مذہبی تعصب میں اس کو روا رکھتے ہیں کہ مخالف عقیدہ رکھنے والوں کے گھروں اور ان کی عبادت گاہوں کو جلا دیا جائے۔ عارفِ رومی نے کیا خوب کہا ہے کہ ——— "خلق را از انبیا آزادی است"

کہ انبیا دنیا میں اسی لئے مبعوث ہوتے ہیں کہ وہ انسانوں کو تقلید اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرائیں اور سب کو محبت اور رواداری کا سبق پڑھائیں، لیکن ہر مذہب اپنے انحطاط کے دور میں متعصب ہو جاتا ہے۔ اور دین کا اصل منشا مسوخت ہو جاتا ہے۔ رواداری اور آزادئ فکر ہی تمام اقدارِ حیات کی تولید و ترقی کی ضامن ہیں۔ جہاں یہ آزادی سوخت ہوئی نہ اخلاق باقی رہتے ہیں اور نہ دین میں اصلاحِ نفوس کی صلاحیت رہتی ہے علوم و فنون کی ترقی رُک جاتی ہے تقلید اور جمود زندگی کے تمام شعبوں پر چھا جاتے ہیں تحقیق کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کا احیا تب تک ناممکن ہے، جب تک کہ آزادئ فکر رواداری اور تحقیق تمام ملت کا شعار نہ بن جائے۔ حقیقی اسلام یہی تھا اور جس غیر مسلم قوم نے بھی ترقی کی ہے وہ اسی شعار کی بدولت کی ہے۔ بقولِ اقبال

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

حکمتِ رومی

مولانا جلال الدین رومیؒ کے افکار و نظریات ایسے دائمی حقائق ہیں جن کی اہمیت اور قدر و قیمت میں گردشِ زمانہ کوئی کمی نہ کر سکی اور ان کی مثنوی سے جس کو "قرآں در زبانِ پہلوی" کہا گیا ہے۔ علامہ اقبال بھی ویسے ہی متاثر ہوئے جیسے کہ مولانا جامی۔ حکمتِ رومی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی بلند پایہ تصنیف ہے جو ماہیتِ نفسِ انسانی، عشق و عقل، وحی و الہام، وحدتِ وجود، احترامِ آدم، صورت و معنی، عالم و اسباب اور جبر و قدر جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے اور خلیفہ صاحب نے مولانائے روم کے افکار کا دوسرے حکماء کے خیالات سے موازنہ کرتے ہوئے ان کی ایسی حکیمانہ تشریح کی ہے جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے ذہن و فکر کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے اور ان مباحث کے متعلق صحیح اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کرنے میں مفید و معاون ثابت ہوگی۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ ۲۔ کلب روڈ۔ لاہور (پاکستان)

آنریبل جسٹس عبدالرشید

تعدد ازواج اور قرآن

میں نے مجلہ ثقافت (جون ۱۹۵۵ء) میں اسلام کے ازدواجی قوانین کے متعلق ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا مضمون بہت غور سے پڑھا اور ان کے خیالات سے بڑی حد تک متفق ہوں۔ تاہم چند امور ایسے ہیں جو میرے خیال میں مزید وضاحت کے مستحق ہیں۔ خلیفہ صاحب کے مضمون سے بحیثیت مجموعی اور صفحات ۹ و ۱۳ پر اس کے بعض فقروں سے بالخصوص یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہماری عدالتیں اور مجلس قانون ساز ایسی عورت کی کوئی امداد نہیں کر سکتیں جس کا شوہر کسی معقول وجہ کے بغیر محض تسکین نفس کے لئے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کر لیتا ہے۔ لیکن میری رائے اس کے برعکس ہے اور اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ اگر مجلس قانون ساز اس معاملہ میں مداخلت کرے اور آجکل جس قسم کی دوسری شادی کرنے کا طریقہ ایک فیشن بن گیا ہے اس کو روکنے کیلئے مناسب قوانین بنائے تو اس کا یہ عمل مسلمانوں کی ازدواجی زندگی کے متعلق قرآن پاک کے احکام کے عین مطابق ہوگا۔ اپنے اس نظریہ کی تائید میں میرے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) جب قرآن پاک کسی عمل کی اجازت تو دیتا ہے لیکن یہ اجازت بعض شرائط اور پابندیوں سے مشروط ہوتی ہے تو اسلامی مملکت کو ایسے قوانین وضع کرنے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے جو اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھانے سے شہریوں کو روک سکیں۔ قرآن پاک نے دوسری شادی کے متعلق جو پابندیاں اور شرطیں عائد کی ہیں وہ ہمارے ازدواجی قوانین کا ایک لازمی جزو ہیں اور اگر حکومت یہ قانون بنائے کہ کوئی مسلمان اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ متعلقہ عدالت سے یہ حکم نہ حاصل کر لے کہ وہ اسلامی قانون کے مطابق دوسری شادی کرنے کا مجاز ہے تو حکومت کا یہ عمل احکام قرآنی کو روبہ عمل لانے کے مصداق ہوگا اس ضمن میں میری تو یہ بھی رائے ہے کہ جو شخص دوسری شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو عدالت اس کے خلاف حکم امتناعی جاری کر کے اس شادی کو روک دے تاوقتیکہ وہ عدالت کو یہ اطمینان نہ دلائے کہ وہ ان شرائط کو پورا کرنے کے قابل ہے جو شریعت نے دوسری شادی کے سلسلے میں عائد کی ہیں۔ قرآن پاک کی عائد کردہ شرطوں اور پابندیوں پر عمل کرنا تو درحقیقت ایک مستحسن فعل ہے اور کوئی معقول مسلمان مذکورۂ بالا نوعیت کے قانون سے روگردانی نہیں کر سکتا۔

(۲) دوسرا اہم نکتہ جس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ قرآن مجید نے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کی اجازت محض یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لئے دی ہے چنانچہ قرآن پاک کے چوتھے پارے کی تیسری آیت (سورۃ النساء) میں جو درج ذیل ہے، یہ وضاحت موجود ہے کہ:

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء

مثنیٰ وثلٰث وربٰع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ -

اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور صرف اسی صورت میں، ان عورتوں میں سے تم کو جو پسند ہوں دو، تین یا چار تک سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم ان سے عدل قائم نہ کر سکو گے تو پھر تم صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کرو۔

یہ سورۂ نساء کی تیسری آیت ہے اور اگر ہم اس سے قبل کی آیت یعنی دوسری آیت کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کے اس حصہ میں یتامیٰ کے حقوق اور اولیاء کے فرائض پر بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ یتامیٰ کی املاک کو بجنسہ ان کے حوالے کیا جائے اور اولیاء اچھی اشیاء کے بجائے جو یتامیٰ کی ملکیت ہوں، ان کو ناقص و ناکارہ چیزیں دے کر ان کا مال خرد برد نہ کریں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ سورۂ نساء جنگ احد کے فوراً بعد نازل ہوئی تھی۔ اس جنگ میں توانا و تنومند مسلمان بڑی تعداد میں شہید ہو گئے تھے اور ایسے یتیموں اور بیواؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کا کوئی والی و وارث نہ تھا۔ ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت ان خاص حالات میں دی گئی تھی جو اس وقت کی مسلم سوسائٹی کو درپیش تھے۔ اور اب بھی صرف اسی وقت اس کی اجازت ہو سکتی ہے جب کہ ویسے ہی غیر معمولی حالات پیش آئیں اور مملکت یہ اعلان کر دے کہ یہ غیر معمولی حالات موجود ہیں۔ ایسی صورت میں متعلقہ عدالتیں جنھیں حکومت نے اس غرض کے لئے قانون سازی کے بعد قائم کیا ہو، ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دے سکتی ہیں۔ نیز ان عدالتوں کے لئے بھی یہ لازمی قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ دوسری شادی کی اجازت دینے سے قبل ان یتامیٰ کی نشاندہی کرائیں جن کے مفاد کی حفاظت دوسری شادی کا مقصود ہے۔ اگر یتامیٰ کا مسئلہ موجود نہ ہو گا، تو عدالت دوسری شادی کی اجازت دینے سے نہ صرف انکار کر دے گی بلکہ اس شادی کو روکنے کے لئے حکم امتناعی بھی جاری کرے گی۔ کیونکہ غیر معمولی حالات کے لئے جو اجازت دی گئی ہے اس سے مسلمان ایسے زمانہ میں مستفید نہیں ہو سکتے، جب کہ یہ حالات موجود نہ ہوں۔ جہاں تک کہ مستقبل پر ہماری نظر جا سکتی ہے ایسے حالات پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ موجودہ زمانہ میں جنگوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان میں عورتوں اور بچوں کی جانیں بھی اسی طرح تلف ہوتی ہیں جیسے کہ مردوں کی۔

(۳) تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جب تک کوئی مسلمان اپنی سب بیویوں سے مکمل انصاف نہ کر سکے اس کو صرف ایک ہی شادی کرنی چاہیئے۔ اب اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ شادی کر سکتا ہے، تو مجلس قانون ساز یہ قانون بھی بنا سکتی ہے کہ دوسری شادی کرنے کے لئے عدالت کا حکم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور ایسا کوئی حکم اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک کہ شوہر کے وسائل معاش اتنے کافی نہ ہوں کہ وہ اپنی سب بیویوں اور بچوں کو ان کے موجودہ معیارِ زندگی کے مطابق رکھ سکے۔ نیز اس حکم میں یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ ہر ایک بیوی کا حصہ کیا ہو گا؟ پہلی بیوی کو اس کا حصہ کس طرح ملے گا، اور اس امر کی کیا ضمانت ہو گی کہ شوہر بلا ناغہ یہ حصہ ادا کرتا رہے گا۔ اگر عدالت کو یہ معلوم ہو کہ شوہر کے وسائل ناکافی ہیں تو وہ اجازت دینے سے نہ صرف انکار

کردے بلکہ حکم امتناعی جاری کر کے شوہر کو دُوسری شادی کرنے سے روک دے۔ عدالت کا یہ فیصلہ اور حکم دراصل قرآن مجید کے منشار کے عین مطابق ہوں گے اس لئے مذہبی بنیاد پر ان کی مخالفت کا امکان نہیں رہتا۔

(۴) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کے سلسلہ میں قرآن مجید نے جو شرطیں اور پابندیاں عائد کی ہیں اگر ان کو سختی سے روبہ عمل لایا گیا تو بہت سے لوگ ان پابندیوں سے بچنے کے لئے پہلی بیوی کو طلاق دیدینگے اس طرح پہلی بیوی اپنے گھر بار اور امن وحفاظت سے محروم ہو جائے گی اور اس کی یہ حالت موجودہ حالت سے بھی بدتر ہو گی۔ لیکن میں اس رائے سے متفق نہیں۔ کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معقول وجہ کے بغیر محض تسکین نفس کی خاطر ایک زیادہ حسین اور کمسن عورت سے شادی کرنے کے لئے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے تو یقیناً وہ ایک ایسا قابلِ نفرت انسان ہے جسے عزّت اور انصاف کا مطلق پاس نہیں ہوتا۔ اور پہلی بیوی کے حق میں یہ بہت بہتر ہوگا کہ وہ ایسے شخص کے ساتھ رہ کر آپ اپنی توہین کرانے کے بجائے اس سے طلاق حاصل کرے۔ طلاق کے بعد پہلی بیوی اور اس کے بچوں کی پرورش ونگہداشت کا مسئلہ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا اور اس کے لئے مناسب قوانین بنانا چاہیئے۔ میں اس ضمن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک ایسا شخص جو کوئی عذر تراش کر قران پاک کے احکام سے انحراف کرتا ہے اس بات کا مستحق نہیں رہتا کہ نگہداشت کی مدّت اور اس کے لئے دی جانے والی رقم کے سلسلہ میں قرآن پاک سے کوئی فائدہ اُٹھا سکے۔ عدالت میں کسی شخص کو ایک ہی سانس میں متضاد باتیں کہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ازدواجی قوانین میں اس بات کو واضح کر دینا چاہیئے کہ پہلی بیوی اور اس کے بچے، اگر ہوں تو، سابق شوہر کی نصف آمدنی کے حقدار ہوں گے تاوقتیکہ بیوی دوسری شادی نہ کرے اور اس کے بچوں کی عمر اکیس سال نہ ہو جائے۔ ازدواجی عدالتوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اس قسم کے مقدمات کا فوری تصفیہ کر کے بلا تاخیر امداد دے سکیں۔ نیز کورٹ فیس اور دوسرے عدالتی مطالبات سابق شوہر سے دلوائے جائیں۔ اس طرح ازدواجی عدالتیں ان اُصولوں کی علمبردار ہوں گی جو قرآنی احکام پر مبنی مسلمانوں کے ازدواجی قوانین کی اساس ہیں۔

(۵) یہ بات بہت ہی افسوس ناک ہے کہ ہماری حکومت معاشری اصلاح سے متعلق امور میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ کیا اس کوتاہی کا سبب یہ ہے کہ بہت سے اعلیٰ عہدہ دار اس جرم کے بدترین مرتکب ہیں؟

مولانا عبدالمجید سالک

اسلامی ہند میں علم کی سرپرستی

(۱)

ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں حکمران کی ذات کو سیاست، معاشرت، جنگ و دفاع اور دوسری ملکی سرگرمیوں کے اعتبار سے مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل تھی اور ملک کی خوشحالی یا بدحالی کا تمام تر انحصار حکمران ہی کی صفات پر تھا۔ علوم و فنون کی ترویج و ترقی کا بھی یہی حال تھا۔ اکثر سلاطین اپنے ثقافتی فرائض کا احساس رکھتے تھے اور ان کے زمانوں میں علوم اور درس و تدریس نے حیرت انگیز ترقی کی، کیونکہ سلاطین علم کی حوصلہ افزائی کے لئے اوقات بھی وقف کرتے تھے اور روپیہ بھی پانی کی طرح بہاتے تھے۔ اس فصل میں یہ بتانا مقصود ہے کہ سلطان محمود غزنوی سے لے کر آخری بادشاہوں تک علماء کی قدردانی اور ترویج علم کے سلسلے میں کیا کام ہوا۔

محمود غزنوی: تمام مورخین متفق ہیں کہ محمود غزنوی علم و فن کی قدردانی میں اپنے تمام معاصر حکمرانوں سے بڑھا ہوا تھا۔ حمد اللہ مستوفی کا بیان ہے کہ ہر سال یہ سلطان علماء و شعراء کی امداد میں جو روپیہ صرف کرتا تھا۔ اس کی مقدار چار لاکھ دینار تھی[1]۔ اس نے مرمر خارا کی ایک عظیم الشان اور خوبصورت مسجد بنائی جو بیش بہا قالینوں اور سنہری و روپہلی فانوسوں اور آرائش کے دوسرے سامانوں سے مزین تھی ایک دارالعلوم قائم کیا جس میں مختلف زبانوں کی بے شمار عجیب و نادر کتابیں جمع کیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجائب گھر بھی تھا۔ اس وسیع ادارے کے انصرام کے لئے طلبہ کے گزارے کے لئے اور علوم و فنون کے عالی قدر اساتذہ کے لئے بیش قرار رقم وقف کی۔ عنصری ایک بہت بڑا عالم، فلسفی اور شاعر تھا جسے محمود نے اپنے دربار میں ادبیات کا محتسب مقرر کر رکھا تھا۔ وہ غزنی کی اس یونیورسٹی کی صدر مدرسی پر مامور ہوا[2]۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ کسی دوسرے بادشاہ کے دربار میں علماء و فضلا کا اتنا بڑا مجمع نہ تھا جتنا محمود غزنوی نے اپنے گرد جمع کر رکھا تھا[3]۔

محمود کے جانشین: محمود کا جانشین مسعود علماء و فضلا کا اتنا بڑا قدردان تھا۔ کہ وہ دور دور سے اس کے دربار کی طرف کھچے چلے آتے تھے۔ ان میں ایک بہت بڑا فلسفی اور ہیئت دان ابوریحان خوارزمی تھا جس نے علم ہیئت پر ایک عمدہ کتاب "مسعودی" کے نام سے لکھی جس کے صلے میں اس کو ایک ہاتھی کے بار کے برابر چاندی عطا کی گئی۔ ایک اور فقیہ و عالم ابو محمد نسائی نے امام ابوحنیفہؒ کی فقہ پر کتاب لکھی۔ اس کتاب کا نام بھی سلطان کے نام پر مسعودی ہی رکھا گیا۔ مسعود نے اپنے عہد حکومت کے آغاز میں بہت سی مسجدیں بنائیں اور اپنی قلمرو کے مختلف شہروں میں بے شمار مکاتب و مدارس قائم کر کے ان کو عطیات و اوقاف سے مالا مال کیا[4]۔ سلطان علماء کی صحبت کو بے حد پسند کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس کے اس قدر گرویدہ تھے کہ اپنی کتابیں اسی کے نام پر معنون کرتے

---

۱ تاریخ گزیدہ ایلیٹ سوم ص۶۳ ۔ ۲ فرشتہ جلد اول ص۹ ۔ ۳ فرشتہ جلد اول ص۶۶-۹۷ ۔ ۴ فرشتہ جلد اول ص۱۱۳-۱۱۴ ۔